شعری اسلوب کی جبریت اور اُردو نثر

ڈاکٹر روِش ندیم*

Abstract:

Socio political economy of every era constructs a metaphysics which develops the literary ethos even. As poetry has always been the first creative expression of each society, so it isinfluenced by the concept of reality of its age. In this way Urdu prose has always been influenced by the styles of Urdu poetry from the medieval age to the modern age.

تاریخ کو پتھر، کانسی یا لوہے کے عہد میں تقسیم کریں یا قبیلہ واری، غلام داری، جاگیرداری عہد میں، اسے دیومالائی، مذہبی، فلسفیانہ ادوار میں بانٹیں یا پدرسری و مادرسری ادوار میں، تاریخ کا ہر عہد مخصوص سیاسی سماجی اور معاشی حالات کا حامل رہا ہے۔ یہ حالات جس قسم کی مابعد طبیعات کی تشکیل کرتے ہیں اس عہد کا تصور حقیقت اسی سے جنم لیتا ہے۔ ادب اور اس کا اجتماعی اسلوب اسی تصور حقیقت سے وضع ہوتا ہے۔ قدیم ادوار کا فطرت پر مکمل طور پر انحصار اور تعقل کی بجائے جذبے کا غلبہ شاعرانہ اظہار کے لیے زیادہ سازگار تھا۔ اسی لیے انسان کے فنی و تخلیقی اظہارات میں نثر کے مقابلے میں شاعری کو قدیم تر حیثیت حاصل رہی ہے۔ دیومالائی عہد میں تجریدیت کو شخصی و علامتی صورت دینے کے عمل نے اسے مزید مستحکم کیا۔ اپنی علامتی، تشبیہاتی، استعاراتی تہہ داری کے ساتھ ساتھ آہنگ و توازن کی جمالیاتی پرتوں کے باعث یہ انسانی اظہار کی مقبول ترین فطری شکل رہی ہے۔ اپنی اثر پذیری کے باعث اسے الہامی، وجدانی، روحانی، جادوئی اور دیومالائی قوت سے بھرپور اظہار سمجھا گیا۔ شاید ہی کوئی سماجی عمل یا انفرادی کیفیت ایسی ہو جہاں شاعری کا عمل دخل نہ ہو گیا ہو۔ ماقبل از تجرید کے ادوار میں ہی اجتماعی تخلیقیت کے حوالے سے لوک شاعری کی شکل میں ایک گہری اور مستحکم روایت کی شکل میں موجود تھی۔ تحریر کی ایجاد کے بعد اس روایت کو دستاویزی سطح پر استحکام ملا اور شاعری لوک انداز سے نکل کر انفرادی اظہار کی شکلوں میں آئی تو شاعر کو سماجی سطح پر

* اُستاد شعبہ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ جس کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسے ماورائی قوتوں کا ساتھ حاصل ہے اور وہ ایسی طلسمی طاقت رکھتا ہے کہ اپنے اظہار کے ذریعے لوگوں کی کیفیات، مجمعوں کی صورتحال بدل سکتا ہے۔ لشکروں میں آگ لگا سکتا ہے، مُردوں کو زندگی دے سکتا ہے۔ اسی تصور کے تحت ارسطو نے شاعر کے تعارف میں جس طرح سے اس کا رشتہ دیوتاؤں اور الہام سے جوڑا ہے اسی کے باعث اس نے شاعروں کو اپنی خیالی جمہوریہ سے نکال باہر کرنے کا اعلان کیا تھا۔

تہذیب کے خاص مرحلے میں کسی معاشرے کے مخصوص سیاسی سماجی اور معاشی حالات کے تحت ابھرنے والی ضرورتوں نے تحریر کو متشکل کیا۔ یوں شاعری کے مقابلے میں ادبی نثر کی شروعات بہت بعد میں معاشروں کے مخصوص ارتقائی مرحلوں میں ہوئیں یعنی جب جذبے کے مقابلے میں تعقل کا عمل دخل بڑھ گیا تو نتیجتاً نثر نے جنم لیا۔ بقول شخصے جب انسان فطرت سے نبرد آزما ہوتا ہے تو شاعری وجود میں آتی ہے اور جب سماجی اداروں سے ٹکراتا ہے تو نثر وجود میں آتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعری فطری تقاضوں کے تحت ظہور پزیر ہوئی اور ادبی نثر سماجی ضرورت کے تحت متشکل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ گل گامش اور اوڈیسی کی صورتوں میں شاعری کے قدیم ترین نمونوں کے مقابلے میں نثر کے نمونے بہت بعد میں سامنے آئے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے تہذیبی ترقی کے اس مرحلے پر مابعد طبیعات اور تصور حقیقت میں بھی بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی جس نے نثری اظہار کے قرینوں کو ابھارا یا نثری ادب ایک خاص تاریخی دور میں روح عصر کی تبدیلی کے اظہار کا نام ہے۔

اُردو ادب میں بھی سماجی سیاسی اور معاشی حالات کی تبدیلی صنفی، اسلوبی، تکنیکی، مزاجی حوالے سے مجموعی ادبی سطح پر متاثر کرتی رہی اور اس کے اثرات شعر و نثر دونوں پر یکساں پڑتے رہے۔ لیکن اپنی قدیم، مضبوط اور ہمہ گیر روایت اور عہد کے مزاج سے قریب تر ہو کر تمام حیات و سماج پر غلبے کی وجہ سے شاعری اپنے بہت بعد متشکل ہونے والی نثر پر داخلی و خارجی سطح پر گہرے اثرات مرتب کرتی رہی۔ لہٰذا شاعری کی طرح نثر بھی لکھی گئی تو وہ بھی اسی تصور حقیقت کی پیداوار تھی اسی لیے شاعرانہ اسلوب اور خاصیتوں کی حامل تھی۔ ۱۶ ویں اور ۱۷ ویں صدی میں شمالی و جنوبی ہند میں فارسی تہذیب کے زیر اثر اور پھر ۱۸ ویں صدی میں مغربی تہذیب کے زیر اثر تصور حقیقت میں تبدیلی کا عمل ظہور میں آیا تو شعر و نثر میں تبدیلیاں ناگزیر ہوتی چلی گئیں۔ شاعری کے مقابلے میں نثر کے اپنے انفرادی و اسلوبیاتی وجود کے ارتقا سے سماجی ارتقا کی حرکت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے اردو کی ادبی نثر پر شاعری کی جبریت کا مطالعہ انتہائی دلچسپی کا حامل ہے۔

اُردو شاعری کا باقاعدہ آغاز یوں تو مسلم سلاطین دہلی کے دور سے ملتا ہے لیکن یہ دور بہت مختصر تھا۔ حقیقی

طور پر شعر ونثر سے بھرپور دور دکنی ہی ہے۔نثر پر شاعری کے اثرات کے حوالے سے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ عہد وسطیٰ شاعری کے تقدم کا عہد تھا۔شاعری کی سر پرستی نہ صرف درباری سرکاری سطح پر کی جاتی تھی بلکہ لوگوں کے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بھی یہی قرینہ تھا۔اردو کا ابتدائی نثری دور مثنویوں کے حوالے سے عربی، فارسی اور ہندی روایتوں سے استفادہ ہے۔ یہ تمام روایتیں ہر حوالے سے شاعری سے جڑی ہوئیں یا شاعرانہ روح لیے ہوئے تھیں۔اسی لیے ابتدائی نثر شاعری کے بنیادی جوہر یعنی تخیل یا اس کے عناصر سے لبریز تھی۔داستانوی عناصر بھی شعری خاصیت ہی مانے جاتے ہیں یوں بھی داستان بعض ادبی روایات میں ایک سطح پر شعر ونثر میں واحد صنف بھی رہی ہے۔شعری لوازم کا استعمال اور اس کی علامتی جہتیں داستانی ادب میں بہت گہری ہیں۔پہلی معلوم شعری تخلیق ''گل گامش'' سے لے کر مقدس کتابوں قرآن اور خاص کر بائبل کا اسلوب داستانوی ہے حتیٰ کہ ہندی ویدوں اور ان میں موجود رامائن، مہا بھارت اور بھگوت گیتا وغیرہ کے حوالے سے شعری لوازم اور داستان کے ملاپ کی تاریخ کئی ہزار سال پرانی ہے۔ اُردو ادب میں بھی وجہی کی قطب مشتری سے لے کر شوق کی زہر عشق تک داستانی قصوں کو منظوم کیا گیا۔جبکہ نثری داستانوں کا دور اس کے علاوہ ہے۔اس دور میں تخیل کا بہترین استعمال شعری صنف میں ہی ہوسکتا تھا یوں بھی عموی طور پر اس عہد کے بنیادی موضوعات یعنی عشق وتصوف کے لیے شاعری کا پیرائیہ انتہائی مناسب تھا۔

شاہ پرست پدرسری دکنی سماج جاگیردارو نوابی طبقات کے خادم وآقا میں تقسیم تھا جہاں جنسی تعلق کا اظہار اور یک زوجگی دونوں قابل قبول تھے۔مافوق الفطرت عناصر اجتماعی یقین کا حصہ تھے۔ بہادری، جاں نثاری،قناعت، مسافرنوازی کے علاوہ عشق پسندیدہ جبکہ ظاہر پرستی ولالچ ناپسندیدہ بنیادی اقدار تھیں۔ یہ سب کچھ اس عہد کی شاعری کا بھی ناگزیر حصہ بنے ہوئے تھے۔ یہ عہد مثنوی کی صورت میں شاعرانہ داستانوں کا عہد بھی تھا اور فارسی سے اخذ و ترجمہ کا دور بھی۔فارسی لہجہ، آہنگ، محاورہ و روزمرہ اردو کا حصہ بن رہے تھے۔حتیٰ کہ میراجی حسین خدانما اور میراں یعقوب کے مذہبی رسائل بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ گجرات و بیجاپور کے ہندوی پسند ادب کی بجائے گولکنڈہ میں رفتہ رفتہ تشکیل پاجانے والے فارسیت پسند ادب کی وجوہات میں وہاں کی فارسی دفتری زبان،شعیت و فقہ جعفریہ کے عقائد وغیرہ شامل تھے۔وہاں کے شاہی طبقے میں ایرانی عالموں اور شاعروں کا شدید عمل دخل تھا۔نتیجتاً مغلوں کی فتح دکن سے پہلے ہی فارسی آہنگ، اسلوب، لہجہ، اصناف، تشبیہ ومحاورہ، اوزان وبحور سب فارسیت کے زیر اثر آگئے تھے۔

اُردو ادب میں شاعری کے آغاز کے نمونے تو چودھویں صدی سے ہی ملنا شروع ہوجاتے ہیں مگر ادبی نثر کا آغاز بہت بعد میں اول اول دکنی عہد کے شاہکار ملا وجہی کی 'سب رس' (۱۶۳۵ء) سے ہوا جو کہ طبع زاد تو نہیں بلکہ

فارسی کے تحت فتاحی کی پانچ ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی ''دستور عشاق'' کے نثری خلاصے 'قصہ حسن و دل' سے ماخوز تھی۔ گویا یہ ایک داستانوی قصے سے کشید شدہ مثنوی تھی جس کے اسلوب میں شعر و نثر کی یہ یکجائی عیاں ہے۔ 'اس کا مشن نظم و نثر کا امتزاج تھا۔'(۱) مثلاً سب رس کی نثر کی شعریت دیکھئے:

''الحمد للہ دونوں کوں ہوا وصال، اپنا دل خوش تو سب عالم خوش حال، دل کو ملیا جیو کا جانی، یو وصال مبارک یو خوشی ارزانی، ایتی جفا دل پڑی، تو سیو ھوئی یو وصال کی گھڑی۔''(۲)

چونکہ بنیادی طور پر دکنی عہد طلسماتی فضا، اساطیری مہمات، محیر العقول واقعات، دیومالا، رومانیت اور حسن و عشق پر مشتمل مثنویوں کا عہد تھا جو کہ داستانوں کی منظوم شکلیں تھیں۔ اس لیے وہاں مثنوی کی شاعری کو اولیت حاصل تھی۔ ملا وجہی بنیادی طور پر ایک شاعر تھے۔ ان کی مثنوی 'قطب مشتری' کا اک ٹکڑا دیکھئے:

سودھن کوں گلے شاہ لانے لگے ۔۔۔ یکس سوں سو یک لٹ پٹانے لگے
گھنگھٹ کھول بوسے لیے ذوق سوں ۔۔۔ سو چولی کے بند توڑ سب شوق سوں
پھراتے اتھے ہات شہ ٹھا رٹھار ۔۔۔ کہ تھی شوخ چنچل اتم ذات نار
یتا تن اتھا پاک صاف ہور ہنوار ۔۔۔ کہ ہاتاں پھسلتے تھے بے اختیار (۳)

داستانوی مثنویوں کے تحت اس نثری تخلیق میں بھی ملک سیستان کے بادشاہ عقل کا بیٹا دل آب حیات کی تلاش میں نکلتا ہے جو سلطان عشق کے شہر دیدار کے باغ رخسار میں تھا۔ سلطان عشق کی بیٹی حسن تھی۔ عقل و عشق کے مابین جنگ میں عقل و دل کو شکست ہو جاتی ہے۔ دل کو حسن کے حضور حاضر کیا جاتا ہے۔ آخر طویل مہمات کے بعد ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ سب رس کی داستان اس عہد کی مثنویوں کے تحت طلسماتی فضا، اساطیری مہمات، محیر العقول واقعات، رومانیت اور حسن و عشق میں ڈوبی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں 'سب رس' پر ہندی دوہوں کا بھی اثر ہے لیکن اس پر اس دور کے رواج کے مطابق فارسی شاعری کے شدید اثرات کے تحت لہجے، اسلوب بلکہ صرفی پہلو تک پر اس کا گہرا اثر موجود ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ اپنے عہد کے علمی و ادبی اسلوب کا نمائندہ ہے۔ مثنوی کے شعری و داستانوی عناصر پر مشتمل مسجع و مقفٰی اور رنگین و مرصع یہ قصہ، ابہام، اشاریت، حسن و عشق اور طلسم سے مزین ہے جس میں دل، نظر، عشق، محبت، حسن، خیال، وفا، رقیب وغیرہ کو کردار بنایا گیا ہے۔ آئندہ کے لئے معیار بن جانے والا سب رس کا اسلوب اس عہد کے نئے لسانی و تہذیبی عناصر کا ایسا امتزاج ہے 'جس کے سرے فسانۂ عجائب، طلسم ہوشربا اور فسانۂ آزاد کی نثر سے ملے ہوئے ہیں'(۴) نظم و نثر اور رنگین بیانی پر مشتمل یہ اسلوب ظہوری، خاقانی، انوری سے مقامات حریری و مقامات حمیدی تک پھیلا ہوا ہے جس میں تشبیہوں، استعاروں، صنعتوں، تلمیحوں اور کنایوں کی گہری

بنت موجود ہے۔ایک شاعرانہ معاشرت وکلچر کی نمائندہ یہ شاعرانہ نثر قرون وسطیٰ کا مقبول ترین انداز تھا۔اس مسجع ومقفٰی رنگین اسلوب پر'' خطاطی، بیل بوٹوں اور نقش ونگاری سے مزین مسلم فن تعمیر' کے بھی گہرے اثرات ہیں۔خارجی کے ساتھ ساتھ داخلی شعری آہنگ کی تشکیل کی بنیاد پر ملاوجہی مقفٰی و مسجع عبارت پر پوری طرح انحصار کرتے ہیں۔اسی لیے ان کے ایک نقاد کو کہنا پڑا کہ'' قافیے کے تعاقب میں وجہی پستہ بادام تک پہنچ کر بھی دم نہیں لیتا۔''(۵) وجہی کے اسلوب میں ردیف قافیوں کے تحت مختصر فقروں سے آہنگ کی تخلیق اورانہی کے ذریعے ہی الفاظ کی شعری ترتیب درحقیقت اس عہد کے خارجی شعری اثرات کا اثر ہے۔یہ وہی دور ہے جب دکن پر ایرانی اثرات کے تحت محمود اور فیروز کے ہاں فارسی اسلوب ولب ولہجہ اور رنگ وآہنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔'سب رس' کی یہی نثری زبان ملاوجہی کی شعری داستان مثنوی 'قطب مشتری' میں بھی ملتی ہے۔فتح دکن کے بعد جب فارسی کے غلبے کے زیراثر دکنی کی جگہ نیا اسلوب ادب وزبان جگہ پانے لگا تو انہی دنوں محمد باقر آگاہ نے 'گلزار عشق' کے دیباچے میں لکھا کہ فتح کے بعد 'طرز روزمرۂ دکنی نہج محاورہ ہند سے تبدیل پائے تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی۔''(۶)

شمالی ہند میں اُردو داستان وشعر کا حقیقی ومقبول آغاز بعد میں ہوا۔وجہی کی وفات کے دس پندرہ سال بعد (۸۶۔۱۶۸۵ء) میں دکن مغلوں کے ہاتھوں مفتوح ہو گیا۔۱۷۰۰ء میں تانا شاہ کا انتقال ہوا اور اسی سال ولی نے دلی کا سفر کیا۔اب اُردو کا تخلیقی مرکز دوبارہ اس دہلی میں منتقل ہو گیا تھا جو عالمگیر (۱۷۰۷ء) اور ٹیپو سلطان (۱۷۹۹ء) کے درمیانی دور کے زوال وانتشار کی تصویر تھا جہاں نتیجتاً اوہام پرستی، رسم پرستی، پیر پرستی، بے یقینی، بے عملی اور بے یقینی بھی عام تھی اور شاہانہ، خانقاہی اور مافوق الفطرت کرداروں کی عشقیہ مہمات کی داستانوں کا نشہ بھی لیکن اٹھارہویں صدی میں سیاسی سماجی حالات میں انتہائی سرعت کے ساتھ تبدیلی آنے لگی جس کی بنیاد مغل حکومت کا زوال اور مغربی اقوام کا بڑھتا ہوا اثر تھا۔قرون وسطیٰ کے زوال پذیر تہذیبی ڈھانچے کی جگہ لینے کے لیے مغربی تمدن کی نمائندہ قوتیں میدان میں اتر چکی تھیں۔شہری سطح پر نئی طبقاتی شکل ابھر رہی تھی۔مغل شاہیت کی قوت کے زوال کا اشارہ بہت واضح تھا۔نئی مقامی قوتیں بھی میدان میں سرگرم عمل تھیں جس کا لازمی نتیجہ عوامیت اور اس کی اہمیت کا پھیلاؤ تھا۔قرون وسطیٰ کی مابعد طبیعیات بدل رہی تھیں جس کے تحت تصور حقیقت بھی تبدیل ہو رہا تھا۔پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ فارسیت کا غلبہ اسی طرح قائم رہتا۔

> ''فارسی مغلوں کی شوکت وتجمل کا نشان تھی جب شوکت وتجمل ہی رخصت ہونے لگی تو فارسی کا عروج واقتدار کیونکر قائم رہتا۔''(۷)

مقامیت کے نمائندہ روہیلوں، مرہٹوں، جاٹوں وغیرہ کی تحریکیں اور نئی خودمختار ریاستیں طاقت کے طور پر

ابھریں توانہوں نے بھی مسلم بادشاہت کو کمزور کیا۔ جس سے فارسی زبان بھی اپنے ریاستی مقام و مرتبہ سے گر گئی۔ نئے حالات میں ''اب بادشاہ اوراس کا دربار اس قابل نہیں رہے تھے کہ شعرا اور ادبا کی سرپرستی کر سکیں اس لیے اہل قلم اب دربار سے نکل کر روزگار کی تلاش میں عوامی ہنگامہ خیز زندگی میں آئے اس نے انہیں درباری ماحول کی مصنوعی زندگی سے نکالا اور تکلیفوں اور مصیبتوں نے انہیں حقیقت پسند بنا دیا۔''(۸) حاتم، آبرو، آرزو جیسے شعراء جو فارسی کے بھی ماہر تھے صرف 'وظیفے' بند ہونے پر ہی اُردو کی طرف متوجہ نہ ہوئے بلکہ یہ بدلتے ہوئے حالات کا دباؤ بھی تھا۔ لہٰذا نئی طاقتوں اور نئی ضرورتوں کے باعث اردو نثر کی ایک نئی شکل بھی سامنے آنے لگی۔ تذکروں اور دیگر تصانیف کے فارسی رواج کے باوجود کربل کتھا، محبوب القلوب اور ریاض الجنان وغیرہ اُردو میں اسی لئے لکھی گئیں تاکہ عام لوگوں کو سمجھ آسکیں۔ یہ فارسی سے اردو نثر میں ترجمے کا آغاز بھی تھا لیکن اس طرح کہ نثری اسالیب وطرز بیان کو اُردو میں ڈھالا گیا بالکل اسی طرح جیسے ولی کو سعداللہ شاہ نے مشورہ دیا تھا کہ فارسی کلمے کو اردو کا جامہ پہنا دو۔ گویا یہ کام شاعری میں پہلے اور نثر میں بعد میں شروع ہوا۔

اس وقت مغربی اقوام تبلیغ، بائبل کے ترجمے اور جوشیا کیٹلر اور شلز کی صورت میں اردو قواعد ولغات کی ترتیب کے لیے عام وسادہ زبان استعمال کر رہی تھیں۔ انگریز اردو سیکھنے کے لیے منشیوں کو ملازم رکھتے اور عام سادہ زبان میں کتابیں لکھواتے تھے۔ یہ شاہیت کے زوال اور عوامیت اور اس کی اہمیت کے پھیلاؤ کا نتیجہ تھا کہ تفسیر مرادیہ اور موضح القران بھی عوام کے لیے عوام کے سادہ طرز بیان میں لکھی گئیں۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے تراجم وتفسیر قرآن بھی اسی دور میں سامنے آئے۔ حتٰی کہ رستم علی بجنوری نے 'قصہ واحوال روحیلہ' اور مہر چند مہر نے 'قصہ ملک محمد وگیتی افروز' اپنے انگریز شاگردوں، عوامی تفہیم اور نصاب کی ضرورتوں کے دباؤ پر ہی عام وسادہ طرز میں لکھا تھا۔ جبکہ محمد شاہ کے عہد کا اردو کا پہلا معلوم قصہ نواب عیسیٰ خان کا داستان مہر افروز ودلبر کا اُردو جملہ ''فارسی جملے کی ساخت سے آزاد ہوتا محسوس''(۹) ہوتا ہے۔ گو مجموعی طور پر بدلتی ہوئی روح عصر کے زیر اثر فارسی غلبہ زوال پذیر تھا لیکن رجحاں کی ایک لہر پھر بھی جاری وساری تھی مثلاً بعدازاں کئی دیباچوں کی علمی نثر اور خاص کر شاہ عالم ثانی کی تحریریں 'عجائب القصص' اور 'نوطرز مرصع' بھی فسانہ عجائب کی فارسی نثر جیسی مرصع ومسجع ومقفٰی عبارت کی حامل تھیں اور مکمل طور پر فارسی کے انشا پردازانہ اسلوب سے متاثر تھیں جو کہ اپنے عہد کا مقبول ترین نثری اسلوب تھا مگر اس میں بھی جہاں فرنگی کردار کے لیے عام سادہ زبان کا استعمال نئی سماجی سیاسی تبدیلیوں کے اثرات کا پتہ دیتا ہے۔

عالمگیر کی فتح دکن سے پہلے دربار سرکار تک رسائی کے لیے دکنی، فتح دکن کے بعد فارسی، جہاندار شاہ سے اُردو اور پھر انگریزوں کی فتح کے بعد انگریزی ضروری ہوگئی تھی۔ اسی لیے ادب کا اسلوب، لہجہ، طرز بدلتا چلا گیا۔ اس

نے پہلے شاعری کو اور پھر نثر کو بھی متاثر کیا۔ ۱۸ویں صدی کے آغاز میں جہاندار شاہ و محمد شاہ کا دور دراصل آبرو اور ناجی کا دور تھا۔ اسی دور میں ولی کا دیوان دلی پہنچا تھا۔ یہیں آرزو اور حزیں اور اس کے بعد سودا اور مکیں کے معرکے اس بات کا اعلان تھے کہ اب فارسی کے دن لد چکے ہیں۔ آرزو کی مراختہ نامی ماہانہ اردو محفل اور اس کے بعد آرزو اور آبرو کے شاگردوں نے اُردو کی بنیاد پر مضمون و درد اور میر و سودا کے لئے نیا شعری پس منظر تیار کیا۔ ایہام گوئی کے دوران بھی جو زبان استعمال ہوئی وہ عام سادہ زبان تھی۔ اس کے ردِعمل میں حاتم اور آرزو نے ہی سادہ گوئی کی تحریک شروع کی جو میر اور درد کا اسلوب ٹھہری۔ سودا کا اسلوب دراصل اس کا طبقاتی مسئلہ تھا جو شاہی دربار کے ساتھ وابستگی کا لازمی نتیجہ تھا لیکن اس کے ہاں بھی قصائد اور غزل کو چھوڑ کر ذرا شہر آشوب اور ہجو ملاحظہ فرمائیں۔

۱۸ویں صدی کے آخر تک انقلاب فرانس کو ایک سو سال اور انقلاب انگلستان کو ڈیڑھ سو سال گزر چکے تھے۔ وہاں کلیسائی، جاگیرداری، بادشاہی اور نوابی نظام ختم ہو چکا تھا اور سرمایہ داریت و جمہوریت کی بنیادیں مستحکم ہو چکی تھیں۔ جدید علوم اور سائنس کی ترقی نے وہاں کے معاشرے کو بدل کر رکھ دیا تھا جب کہ اس کے مقابلے میں ہندستان اس حوالے سے بہت پیچھے تھا۔ بقول سبطِ حسن:

> ''ادھر یورپ میں صنعتی، سماجی اور ذہنی انقلاب کے باعث زندگی کا پرانا نظام بدل رہا تھا اور انسان اپنے لیے ایک نیا ماحول، نئی دنیا تخلیق کر رہا تھا۔ لیکن ادھر ہمارے ملک کے فرماں روا اور امرأ سلطنت ان تغیرات سے بے خبر عالی شان عمارتیں بنوانے، رقص و موسیقی کی محفلیں سجانے، شعر و سخن کی مجلسیں آراستہ کرنے، زرق برق لباس پہننے اور عمدہ عمدہ کھانے پکوانے میں مصروف رہتے تھے۔''(۱۰)

لہٰذا جب یورپی اقوام ہندستان میں وارد ہوئیں تو وہ اپنے ساتھ وہی تصورات و افکار لے کر آئیں۔ یوں اہل یورپ کی طرف سے ہندستان میں اردو ادب کے حوالے سے ہونے والی کاوشیں انہیں کے تصورِ حقیقت کے تحت تھیں۔ شاہیت کے زوال کے ساتھ ہی چونکہ قرونِ وسطیٰ کی روح بھی پژمردہ ہو چکی تھی لہٰذا اب تعقل، شعور اور عوامیت نئے عہد کی پہچان تھے۔ عہد کے اس تقاضے کو اپنی پچانوے سالہ زندگی میں نظیر اکبرآبادی (۱۷۳۵ء۔۱۸۳۰ء) نے خوب نبھایا۔ ''نظیر کی تخلیقی قوت نے اردو شاعری کے اس روایتی قلعہ پر ضرب لگائی جو فارسی شاعری کی روایات پر کھڑا تھا۔''(۱۱) اسی لیے فورٹ ولیم کالج کا اپنی نصابی ضرورتوں کے تحت بنائے گئے نصاب کی سلاست، سادہ زبانی اور عام فہمی اردو زبان و ادب کی روح بن گئی۔۔ جس طرح میر بہادر علی حسینی نے 'نثر بے نظیر' کے انگریزوں اور باذوق ہندستانیوں کے لیے دو الگ الگ نسخے تحریر کیے تھے اسی طرح ایک ہی داستان کا نوطرز مرصع اور قصہ چہار درویش کی دو صورتیں اختیار کرنا دراصل ہندستان میں بدلتے ہوئے تصورِ حقیقت کا عکاس تھا۔ اسی لئے گل کرسٹ نے عام فہم و

سادہ باغ و بہار برائے 'صاحبانِ نو آموز' کے دیباچے میں لکھا کہ فارسی عربی تراکیب و محاورہ کی زیادتی کے باعث 'چونکہ اسکی عبارت قابل اعتراض تھی اس لیے اس نقص کو دور کرنے کے لیے میر امن دہلوی نے اس کا یہ متن تیار کیا۔'(۱۲) لیکن پھر بھی باغ و بہار پر شعریت کا اثر اور اس کے لوازم کا استعمال واضح رہا۔ 'میر کے یہاں نثر کا وزن بھی ہے اور قافیوں یا ہم صوتی الفاظ سے بھی انہوں نے فائدہ اٹھایا۔'(۱۳) اور 'باغ و بہار کی انشاء جہاں شعری محاسن سے مرصع ہے وہاں قافیے کے التزام سے بھی خالی نہیں۔'(۱۴) ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول تو میر کے اسلوب شعر کی خوبیوں اور باغ و بہار کی زبان میں بہت اشتراک ہے یعنی 'میر کی غزلوں اور باغ و بہار میں خاص قسم کی مشابہت ملتی ہے۔'(۱۵) اور اس کے اسلوب کی باریکی، تناسب اور آہنگ ان کی نثر کو شاعری کے قریب لاتی ہے۔ حتیٰ کہ ملک جائسی کی پدماوت سے ماخوذ 'باغ و بہار' کے ردِعمل میں لکھی گئی رجب علی بیگ سرور کی داستان 'فسانۂ عجائب' کا اسلوب بھی مختلف ہے۔ جن کا فرق وہی ہے جو میر حسن اور دیا شنکر نسیم کی مثنویوں کے اسلوب میں ہے۔ یہ شعریت میں ڈوبا ہوا مقفیٰ و مسجع فقروں، تشبیہوں، استعاروں سے مرصع اسلوب ہے۔ 'بعض جملوں میں ردیف و قافیہ ایسا بے ساختہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں شعر کا ترنم پیدا ہو گیا۔'(۱۶) مثلاً دیکھئے: ''حسرت دنیا سے کفن چاک ہوا بستر دونوں کا فرش خاک ہوا رنگ چمن صرف خزاں دیکھا، ڈھلا ہوا حسن گل و رخاں دیکھا۔ اس لڑائی کا قصہ فسانہ ہو جائے گا۔ امروز فردا مسافر روانہ ہو جائے گا۔''(۱۷)

انگریز ملازمین کی ضرورتوں کے تحت فورٹ ولیم کالج کی نصابی ضرورتوں کے تحت سادہ و آسان زبان ناگزیریت اردو ادب کی ناگزیریت بنتی چلی گئی۔ تبدیلی کا یہ عمل مکاتیب غالب اور تحریک سرسید تک آتے آتے اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ شاعری میں بھی غالب کی طرز بیدل سے دوری اور سادہ گوئی کی طرف آمد دراصل وہ دباؤ تھا جو روح عصر کا اظہار تھا بعد ازاں مکاتیب غالب اسی کا عروج ہے۔ غالب نے اپنے عہد کی پکار بہت جلد سن اور سمجھ لی تھی۔ اسی لیے تو اس نے سرسید احمد خان کی 'آثار الصنادید' کی اولین اشاعت پر اس کی تقریظ لکھ کر اس کا مذاق اڑایا تھا اسی نے غالباً سرسیّد کے اس شعور کے لیے راہ ہموار کر دی تھی جو 'آثار الصنادید' کی دوسری اشاعت سے لے کر آخر تک نظر آتا ہے۔ اسی کے تحت سرسید احمد خان کے نئے ادب کے لیے تشکیل کردہ تصور میں تصنع، تکلف اور بناوٹ کے خلاف سادگی و مدعا نگاری کو بنیادی حیثیت دی۔ حتیٰ کہ سرسید تحریک کے مخالفین مثلاً اکبر اور اودھ پنچ کے دیگر لکھاری بھی انہیں خصوصیات کے حامل تھے۔ فورٹ ولیم کی نثر نے سلاست و سادگی کے ذریعے جو بے ساختگی و بے تکلفی پیدا کی وہ غالب نثری حتیٰ کہ کئی جگہ شعری تخلیقات میں نمایاں ہے۔ غالب بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن بدلتی ہوئی روح عصر اور تصور حقیقت کے زیر اثر شعری اسلوب میں جو بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں وہ نثر پر بھی اثر

انداز ہورہی تھیں۔ غالب کی نثر میں کہیں کہیں تخیل کی بلند پروازی، تمثیل نگاری میں ڈھل کر شاعرانہ اسلوب میں ڈھلتی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ سرسیّد کے عہد میں مقفیٰ مسجع نثر لکھنے کا رویہ مزید کمزور ہوگیا۔ سرسیّد احمد خان خود بھی ذہنی طور پر قرون وسطیٰ کی بجائے جدید عہد کا نمائندہ تھا۔ اس کا مقصدیت اور اجتماعیت کے تحت تخیل کی بجائے عقلیت وحقیقت پر مشتمل نظریاتی وفکری رویہ شاعری کی بجائے نثر کے لیے موزوں تھا مگر سرسیّد تحریک میں شاعری کے مرکزی صنف اظہار انہ ہونے کے باوجود حالی وآزاد کی جدید شاعری کی زبان وبیان سب نئے تقاضوں سے ہم آہنگ تھی یہی تسلسل بعدازاں پریم چند کی حقیقت نگاری اور ترقی پسند ادب میں بھی قائم رہا۔

شعریت کی روح سرسیّد احمد خان کی تحریروں میں بھی در آتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے انشائی مضامین مثلاً امید کی خوشی، ہمدردی، گزرا ہوا زمانہ، آدم کی سرگزشت، بحث وتکرار وغیرہ میں تمثیل نگاری ومنظر نگاری سے کام لیا ہے۔ اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں محاورے کے ساتھ ساتھ تمثیل نگاری (اسم بامسمیٰ کردار)، تشبیہ اور استعارے سے کام لینا شعری لوازم کی نثر میں استعمال کی بہترین مثالیں ہیں۔ جبکہ محمد حسین آزاد کی 'نیرنگ خیال' اور 'آب حیات' میں تمثیل، تشبیہ، استعارہ، رمزیت، کنایہ وغیرہ کے ساتھ شعری اسلوب کا غلبہ تو انتہائی واضح ہے جو نثر میں نظم کا احساس پیدا کرتا ہے حتیٰ کہ پریم چند کے ہاں بھی فضا، رمزیت، مرصع سازی، کنایہ، عبارت آرائی، جذبات، رومان اور تخیل وغیرہ جیسے داستانوی عناصر کا استعمال اس ضمن میں قابل مطالعہ ہے۔ یہی وہ عہد ہے جب حالی وآزاد کی نظم نگاری کے برعکس نظم کے نئے تجربات ہور ہے تھے۔ جو آخر کار ن م راشد اور تصدق حسین خالد کی آزاد نظم نگاری کی صورت میں بھی سامنے آئے اور ترقی پسند شاعری میں۔ انفرادی علامت نگاری اور نظمیہ ہیت کے ذریعے نیا شعور اپنا اظہار پانے کو تھا۔ فرائیڈ ومارکس سے لے کر وجودیت وجدیدیت تک آگہی کا ایک نیا جہاں آباد ہورہا تھا۔ اسی کے زیر اثر نئی وجدید شاعری کی جو روایت سامنے آئی وہ حالی وآزاد کے شعور سے مختلف تھی اسی لیے اس کا اسلوب وہیئت بھی منفرد تھے۔ اسی شاعری نے ترقی پسند اور حلقہ ارباب ذوق کی فکشن کی روایت کو متاثر کیا۔ حتیٰ کہ جب ن م راشد اور میراجی کے علاوہ ساحر لدھیانوی اور فراق وفیض نئی آگہی کی پختہ تر پکار تسلیم کیے جارہے تھے، منٹو ''بارده شمالی'' اور 'پھندنے' کی تشکیل کررہا تھا۔ اسی تسلسل میں افتخار جالب، جیلانی کامران، وزیر آغا، انیس ناگی کی نئی یا جدید نظم اس حوالے سے جدیدیت پسند اور علامتی افسانہ نگاری کے لیے فضا کی تشکیل کررہی تھی جس نے بعدازاں انور سجاد سے لے کر رشید امجد تک کو متاثر کرنا تھا۔ ساٹھ کی دہائی کے جدید افسانے میں بقول ڈاکٹر بشیر سیفی 'شعری اسلوب اور شعری استعاراتی نظام کا بھی رواج ہوا۔''(۱۸) جدید افسانہ شاعری کے جوہر کے نزدیک آرہا تھا۔'(۱۹) ......'نثر ونظم کے مابین دیواریں گررہی تھیں۔'(۲۰) بقول شہزاد منظر اُردو افسانہ'۔۔۔انشائیہ اور نثری شاعری کے قریب پہنچ گیا......(اور)

انشائیہ اور نثری نظم کے درمیان کی صورت اختیار کر لی۔"(۲۱) شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق 'نئے افسانے کی اسی شعری زبان نے ہی اس پر یہ الزام لگوایا کہ وہ عصری حقیقتوں سے بے نیاز اور سماجی مسائل سے بے پرواہ ہے۔"(۲۲)

حوالہ جات

۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۱

۲۔ وجہی، ملا، سب رس، مرتبہ، عبدالحق، کراچی: انجمن ترقیٔ اُردو، ص ۶۴

۳۔ وجہی، ملا، قطب مشتری، مرتب: پروفیسر وہاب اشرفی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۵ء، ص ۲۷۷

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد اوّل) لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۵ء، ص ۴۵۹

۵۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، اُردو کی نثری داستانیں، کراچی: مکتبہ ترقی اُردو، پاکستان، ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۸

۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد اوّل) ص ۳۷۷

۷۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا سیاسی وسماجی پس منظر، مطبع لاہور: جامعہ پنجاب، ۱۹۶۶ء، ص ۶۶

۸۔ اقبال خان، اُردو اور سیکولرازم، لاہور: نگارشات، ۱۹۸۹، ص ۱۰۹

۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد دوم) لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۵ء، ص ۹۹۴

۱۰۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، کراچی: دانیال، ۱۹۷۸ء، ص ۳۸۷

۱۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ، ص ۵۵۲

۱۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد دوم) ص ۱۱۰۱

۱۳۔ ابوالخیر کشفی، سیّد، مقدمہ، باغ و بہار، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۹۲ء، ص ۵۴

۱۴۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، ۱۹۶۵ء کے بہترین مقالے، لاہور: مکتبہ البیان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۸

۱۵۔ سلیم اختر، داکٹر، داستان اور ناول، لاہور: مکتبہ عالیہ، س ن، ص ۵۷

۱۶۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، اُردو کی نثری داستانیں، کراچی: مکتبہ ترقی اُردو، پاکستان، ۱۹۹۱ء، ص ۳۵۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۵۴

۱۸۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، نئے پاکستانی افسانہ نگار، ماہنامہ مدیر، نومبر، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۲۷

۱۹۔ قمر حسن، نیا اُردو افسانہ: ارضیت اور سماجی معنویت، مشمولہ: اُردو افسانہ: روایت اور مسائل، مرتبہ: گوپی چند

نارنگ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۱ء، ص ۶۵۵

۲۰۔ دیوندر اسر، ہندستان میں اُردو افسانہ، مشمولہ: اُردو افسانہ: روایت اور مسائل، ص ۶۱۳

۲۱۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اُردو افسانے کے پچاس سال، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۶

۲۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کچھ جدید افسانے کے بارے میں، مشمولہ: اُردو افسانہ: روایت اور مسائل، ص ۶۵۶

❀❀❀